R-N-2/56-57 REGD-NO-L922

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

فون نمبر ۲۹
سالانہ قیمت ۵ روپے
فی کاپی ۱۵ پیسے

تاریخ ہائے اشاعت
۱-۸-۱۵-۲۲

جلد ۷- شمارہ ۴۰ | ایڈیٹر: آل احمد سرور | ۲۲ر اکتوبر ۱۹۶۸ء

اداریہ

رسم خط کا مسئلہ

دراصل کسی زبان کا کسی خاص رسم خط سے کوئی لازمی رشتہ نہیں ہوتا مگر کوئی زبان اگر عرصۂ دراز تک ایک رسم خط میں لکھی جائے اور اس کا علمی و ادبی سرمایہ اسی رسم خط میں ہو تو پھر یہ رسم خط اس زبان کے ساتھ وابستہ ہو جاتا ہے اور اسے چھوڑنا گوشت سے ناخن کو جدا کرنے کے مترادف ہوتا ہے۔ جو لوگ کوئی زبان پہلی دفعہ سیکھ رہے ہیں انھیں تو کسی رسم خط میں وہ زبان سکھائی جا سکتی ہے مگر جو لوگ ایک رسم خط کے عادی ہیں انھیں کسی دوسرے خط میں لکھنے پر مائل کرنا بہت مشکل ہے پھر ان کے اپنی زبان کو پڑھنے اور اس میں لکھنے کی رفتار سست ہو جاتی ہے۔ پڑھنے اور لکھنے میں وہ لطف حاصل نہیں ہوتا جو الفاظ کے نقش ہو جانے اور دل میں اتر جانے کے لئے ضروری ہے، خیال کی رو ہموار نہیں رہتی بلکہ معلوم ہوتا ہے آدمی آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھ رہا ہے۔

اس لئے جو لوگ اردو رسم خط کو ترک کر کے دیوناگری یا رومن رسم خط اختیار کرنے کی بات کرتے ہیں وہ زبان اور نفسیات کے رشتے کو نظر انداز کر دیتے ہیں اور جو لوگ اس رسم خط کی خامیوں کی وجہ سے اسے چھوڑنے کا مشورہ دیتے ہیں وہ ہر معمولی بیماری کا علاج عمل جراحی سے کرنا چاہتے ہیں۔ ہمارے نزدیک اردو رسم خط اب اردو زبان کی تاریخ اس کے سارے ادبی سرمائے اور ہمارے ادبی مزاج سے اس قدر ہم آہنگی اختیار کر چکا ہے کہ اب اسے ترک کر کے کسی دوسرے رسم خط کو اختیار کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہونا چاہئے۔ ہاں تعلیم و تدریس کی ضروریات اور موجودہ دور میں ٹائپ رائٹر، ٹیلی پرنٹر اور چھپائی کی ضروریات کی وجہ سے اس کی اصلاح ضروری ہو گئی ہے اور اسے ٹالنا کسی طرح مناسب نہیں ہے۔ اس سلسلے میں تیس برس سے جو تجویزیں پیش کی جا رہی ہیں، ان کا خلاصہ یہ ہے:

(۱) عام چھپائی کے لئے نستعلیق کے بجائے نسخ کو اختیار کر لیا جائے نستعلیق صرف خاص ایڈیشنوں کے لئے استعمال ہو۔

(۲) سجاد مرزا کا بنیادی ٹائپ اختیار کر لیا جائے جس میں ہر حرف کی صرف دو شکلیں ہیں، پوری اور ادھوری، ابتدا میں درمیان میں ادھوری شکل اور آخر میں پوری شکل استعمال کی جاسکتی ہے۔

(۳) حروف ابجد کی ترتیب صوتی لحاظ سے رکھی جائے نہ کہ صوری لحاظ سے۔

(۴) شروع میں ہم آواز حروف مثلاً ث، س، ص میں سے ایک حرف مثلاً س سکھایا جائے بعد میں دوسرے حروف بھی سکھائے جا سکتے ہیں۔

(۵) ہر حرف پورا لکھا جائے جس طرح انگریزی میں لکھا جاتا ہے۔

دراصل اب تک رسم خط کے معاملے میں ہم افادیت کے بجائے خوش نمائی پر زور دیتے رہے ہیں۔ ہمیں پہلے افادیت اور ضرورت کا لحاظ رکھنا چاہئے بعد میں خوشنمائی کا۔ اس لئے ہماری رائے ہے کہ سجاد مرزا کے بنیادی ٹائپ کے عام طور پر اختیار کرنے میں ہمارا زیادہ فائدہ ہے ہم چاہتے ہیں کہ اصلاح کے معاملے میں جذبات سے قطع نظر کر کے ضروریات کو ملحوظ رکھا جائے۔ جذبات کی پاسداری کی وجہ سے ہی تو ہم اردو رسم خط کو باقی رکھنا چاہتے ہیں مگر اس کی اصلاح کو اب ٹالنا نہیں چاہئے۔ ہمیں موجودہ نسلوں کا خیال ہے مگر آنے والی نسلوں کی ضرورت کو کیسے نظر انداز کریں۔

انجمن اساتذہ اردو جامعات ہند کی تیسری کانفرنس

علی گڑھ۔ انجمن اساتذہ اردو جامعات ہند کی تیسری کانفرنس ۲۰، ۲۱، ۲۲ر اکتوبر ۱۹۶۸ء کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں منعقد ہو رہی ہے۔ اس کانفرنس کا افتتاح ہندوستان کے ممتاز ماہر تعلیم اور نامور ادیب و انشا پرداز جناب خواجہ غلام السیدین فرمائیں گے۔ کانفرنس کے پروگرام کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

۲۰؍اکتوبر ۱۹۶۸ء

افتتاحیہ اجلاس ساڑھے گیارہ بجے دن

خطبۂ استقبالیہ: ڈاکٹر عبد العلیم وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

خطبۂ افتتاحیہ: جناب خواجہ غلام السیدین

خطبۂ صدارت: پروفیسر عبد القادر سروری۔ صدر انجمن اساتذہ اردو جامعات ہند

سالانہ روداد: پروفیسر خواجہ احمد فاروقی۔ سکریٹری انجمن اساتذہ اردو

شکریہ: پروفیسر آل احمد سرور۔ صدر شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

پہلا اجلاس: تین بجے سہ پہر

موضوع: اردو ذریعہ تعلیم کی حیثیت سے

صدر: ڈاکٹر مسعود حسین خاں۔ صدر شعبۂ لسانیات علی مسلم یونیورسٹی۔

کنوینر: نسیم قریشی لکچرر شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

دوسرا اجلاس ساڑھے چھ بجے شام

موضوع: معلمین اردو کے مسائل

صدر: پروفیسر اختر اورینوی۔ صدر شعبۂ اردو پٹنہ یونیورسٹی۔

کنوینر: ڈاکٹر قاضی عبد الستار۔ لکچرر شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

۲۱؍اکتوبر ۱۹۶۸ء

تیسرا اجلاس ساڑھے نو بجے صبح

موضوع: نصاب کے مسائل

صدر: پروفیسر خواجہ احمد فاروقی صدر شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی

کنوینر: عتیق احمد صدیقی لکچرر شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

چوتھا اجلاس تین بجے سہ پہر

موضوع: تدریس کے مسائل

صدر: پروفیسر سید احتشام حسین صدر شعبۂ اردو الہ آباد یونیورسٹی

کنوینر: ڈاکٹر منظر عباس نقوی شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

۲۲؍اکتوبر ۱۹۶۸ء

پانچواں اجلاس ساڑھے نو بجے صبح

موضوع: تحقیق کے مسائل

صدر: پروفیسر گیان چند جین صدر شعبۂ اردو کشمیر یونیورسٹی جموں

کنوینر: ڈاکٹر انصار اللہ نظر لکچرر شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

چھٹا اجلاس۔ تین بجے سہ پہر

موضوع: تنقید کے مسائل

صدر: پروفیسر آل احمد سرور صدر شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

کنوینر: کنور اخلاق محمد خاں شہریار لکچرر شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

کانفرنس کے مختلف اجلاس کے لئے جو مباحث منتخب کئے گئے ہیں ان کے بارے میں متعلقہ شعبوں کے صدارتی خطبوں کے علاوہ مختلف یونیورسٹیوں کے نمائندے اپنے مقالات پیش کریں گے اور ان پر تبادلۂ خیال ہوگا۔ ۲۱؍اکتوبر کی شام میں مندوبین کا ایک تنظیمی جلسہ ہوگا۔

۲۲؍اکتوبر کو چھ بجے شام ایک محفل شعر و سخن منعقد کی جائے گی جس میں مندوبین اور مہمان شعرا کے علاوہ علی گڑھ کے شعرا اپنا کلام سنائیں گے۔

اس کانفرنس میں شرکت کے لئے مختلف یونیورسٹیوں نے اپنے نمائندے بطور خاص نامزد کئے ہیں۔ اب تک جو اطلاعات موصول ہوئی ہیں ان کی تفصیل یہ ہے۔

الہ آباد یونیورسٹی: ڈاکٹر سید رفیق حسین، ڈاکٹر مسیح الزماں

پٹنہ یونیورسٹی: ڈاکٹر اختر اورینوی، ڈاکٹر صدر الدین فضا

عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد: ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ

دہلی یونیورسٹی: صدیق الرحمان قدوائی

گورکھپور یونیورسٹی: ڈاکٹر محمود الٰہی، ڈاکٹر سلام سندیلوی

مگدھ یونیورسٹی: شاہ شکیل احمد

بنارس ہندو یونیورسٹی: ڈاکٹر حکم چند نیر

کشمیر یونیورسٹی: پروفیسر عبد القادر سروری، پروفیسر گیان چند جین

میسور یونیورسٹی: ڈاکٹر آمنہ خاتون

شری وینکٹیشور یونیورسٹی: ڈاکٹر رضی الدین احمد

گجرات یونیورسٹی: وارث حسین علوی

مدراس یونیورسٹی: محمد یوسف کوکن

اودے پور یونیورسٹی: سید ثاقب رضوی

کانپور یونیورسٹی: ایم۔ اے رضوی، رئیس حسن

ان کے علاوہ تقریباً تمام یونیورسٹیوں اور اہم کالجوں سے اردو کے اساتذہ اپنے طور پر اس کانفرنس میں شرکت کے متعلق اطلاع دے چکے ہیں۔ کانفرنس کا افتتاحیہ اجلاس کرکٹ پویلین آف آرٹس میں اور دوسرے تمام اجلاس فیکلٹی آف آرٹس کے لاؤنج میں ہوں گے۔ تمام شرکاء و مندوبین کے قیام و طعام کا انتظام علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کر رہی ہے جناب وائس چانسلر کی طرف سے مہمانوں کو ایک عصرانہ بھی دیا جائے گا۔ کانفرنس کی طرف سے آزاد لائبریری میں اردو مخطوطات، نادر مطبوعات اور معلمین اردو کے تصنیفی کاموں کی ایک نمائش بھی ترتیب دی جا رہی ہے۔

(خلیل الرحمن اعظمی آفس سکریٹری)

سہیل اعظمی کی وفات

نائب انجمن ترقی اردو پنجاب کی ریاستی شاخ کے رکن شری رام رتن بھاردواج سپرنٹنڈنٹ کمشنر نابھہ ایک مختصر علالت کے بعد اچانک انتقال کر گئے۔ مرحوم اردو زبان کے سرگرم حامی، انتھک سوشل کارکن اور خوش فکر شاعر تھے۔ ادبی حلقوں میں وہ سہیل اعظمی کے نام سے مشہور تھے۔ (سوراج تنویر)

سلیم تمنائی

فقیر سید وحید الدین مرحوم

محترم جناب سید مبارز الدین صاحب رفعت کے ہاں راقم اور جناب علی محمد صاحب صدر شعبۂ عربی جامعاتی کالج میسور محو گفتگو تھے۔ موضوع علامہ اقبال اور ان کا مندرجہ ذیل شعر تھا ؎

محمد بھی ترا جبریل بھی قرآن بھی تیرا
مگر یہ حرفِ شیریں ترجماں تیرا ہے یا میرا

دوران گفتگو ڈاکٹر اقبال کا وہ مشہور شعر بھی، جو بال جبریل کا ہے اور بھرتری ہری کے ایک اشلوک سے ماخوذ ہے، زبان پر آگیا، یعنی ؎

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر
مرد ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر

بھائی رفعت صاحب نے اس سلسلے میں "روزگار فقیر" کا نام لیا اور بتایا کہ فقیر سید وحید الدین نے اس شعر سے متعلق پروفیسر آل احمد سرور اور راحت سعید کا ایک دلچسپ واقعہ پیش کیا ہے۔ پھر آپ نے "روزگار فقیر" حصہ اول مہیا کرنے کا وعدہ کیا اور یہ وعدہ محبوب کا وعدہ بنا رہا۔ اس لئے کہ رفعت بھائی سے یار لوگ کتابیں اور رسائل اڑا لے جاتے ہیں اور یہ مشکل لوٹاتے ہیں۔ وہ اس حرکت سے سخت نالاں ہیں۔ گو شکوہ سب کچھ رہتا ہے مگر "نہ" کرنا نہیں آتا۔ مروت میں مارے جاتے ہیں۔

جب "روزگار فقیر" میرے ہاتھ لگی تو اس کی صوری حیثیت پر بھی مرمٹنے کو جی چاہا۔ طباعت کا اعلیٰ و ارفع معیار پیش کیا گیا ہے بڑے شوق سے پڑھا۔ اپنے کام کی کئی چیزیں راقم نے پائیں۔ کیونکہ میں نے اسی زمانے میں اپنی کتاب "داستانِ اقبال" (از دکن آمدہ ام) تقریباً ختم کرلی تھی اور یہ کتاب ڈاکٹر اقبال کے سفر جنوبی ہند سے متعلق تھی۔ جس میں علامہ موصوف کی نایاب و کمیاب تصاویر، تقاریر، غیر مطبوعہ خطوط، سپاس نامے۔ سفر کے دلچسپ واقعات وغیرہ راقم نے جمع کردئے تھے۔

روزگار فقیر کی دونوں جلدیں خاصے کی چیزیں ہیں۔ میں نے اقبال کے سفر جنوبی ہند سے متعلق مزید معلومات حاصل کرنے کی خاطر مصنف روزگار فقیر کو خط لکھنے کی سعادت حاصل کی اور ڈاکٹر اقبال کے سفر مدراس کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا کہ یہ سفر دسمبر ۱۹۲۸ء کے بجائے (جیسا کہ روزگار فقیر میں درج تھا) ۱۹۲۹ء جنوری کو ہوا تھا۔ اس غلط فہمی کی وجہ سے کہ علامہ کو سفر ۱۹۲۸ء دسمبر ہی کو طے پایا تھا مگر علامہ اقبال کی مصروفیات نے انہیں ہیں کا فرق پیدا کردیا۔ وہ آخر دسمبر ۱۹۲۸ء کے بجائے جنوری ۲۹ء کے اوائل ہی میں مدراس تشریف لائے۔ میں نے ہفت روزہ "تازیانہ" لاہور ۲۹ء اور روزنامہ "الکلام" ۲۹ء کا حوالہ بھی دیا تھا۔

اس کے علاوہ میں نے یہ بھی لکھا کہ مرحوم محمد جمیل صاحب کے نام ڈاکٹر اقبال کے جو خطوط چھپ چکے ہیں۔ اس میں اس بات کا بھی پتا چلتا ہے کہ چودھری محمد حسین جو علامہ موصوف کے سفر میں ساتھ رہے، جنوبی ہند خصوصاً میسور کا سفر نامہ لکھنے کے نیک ارادہ رکھتے تھے۔ سنا ہے "زمیندار" یا "انقلاب" میں یہ سفر نامہ چھپ چکا ہے۔

میرے خط کے جواب میں آپ کا ۲۵ر جولائی ۶۷ء کا لکھا ہوا کرم نامہ آیا۔ میں نے اس خط میں میری دریافت طلب باتوں کے علاوہ بہت سی مفید و دلچسپ باتیں بھی تحریر فرمادی تھیں۔

۲۸ - ۷ - ۶۷

عزیز و مکرم تمنائی صاحب
السلام علیکم، مزاج بخیر

عنایت نامہ محررہ ۳ر جولائی نظر نواز ہوا۔ یاد فرمائی کا دلی شکریہ۔ یہ جان کر مسرت ہوئی کہ آپ کو مشرق کے اس عظیم شاعر اور عاشق رسول حکیم الامت علامہ اقبال کی ذات گرامی سے اس قدر قلبی تعلق ہے۔ اور یہ تعلق خاطر آپ کے بزرگوں کے زمانے سے چلا آرہا ہے۔ مزید خوشی اس بات کی ہوئی کہ میری کتاب "روزگار فقیر" آپ کے مطالعہ میں ہے اور آپ نے اس کے مندرجات کو عمیق دلچسپی کی نظر سے دیکھا ہے۔

عام طور پر سفر حیدرآباد، مدراس اور میسور کے بارے میں متضاد حوالے ملتے ہیں، لیکن میں نے یہی کوشش کی کہ "روزگار فقیر" میں واقعات کی صحت پوری طرح قائم رہے۔ آپ نے جو دورۂ میسور کے وقت کا تھوڑا سا فرق واضح کیا ہے وہ اس لئے بھی درست ہو سکتا ہے کہ آپ کی مستقل رہائش میسور میں ہے اور تمام ریکارڈ آپ

مسعود حسین خاں

بیاد پروفیسر نجیب اشرف ندوی مرحوم

حریم اردو کے بیکس کا پاسباں نہ رہا
ہزار حیف کہ اک پیر نوجواں نہ رہا
زبان روتی ہے ، الفاظ سر پٹکتے ہیں
فغاں ! کہ حرف و معانی کا اک جہاں نہ رہا
وہ اٹھ گیا تو یہ ارباب علم پر گزری
زمیں ، زمیں نہ رہی ، آس پہ آسماں نہ رہا
بتا، کہاں تجھے لے جائیں اے جبین نیاز!
وہ سنگ در نہ رہا اور وہ آستاں نہ رہا
کسے بلائیں ، کہاں جائیں اے دلِ محزوں!
وہ میزباں نہ رہا اور وہ میہماں نہ رہا
وہ یادگارِ دبستانِ شبلی و ندوی
ہزار حیف کہ اب اپنے درمیاں نہ رہا
فنا کی منزلیں طے زندگی سے کیا ہوں گی
حیاتِ لغزشِ پا ہے ، یہ اب گماں نہ رہا

کے سامنے ہے۔ "روزگارِ فقیر" میں علامہ کی شخصیت کو میں نے بنیادی طور پر ایک عاشقِ رسول کی حیثیت سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ چونکہ میرے خیال میں ان کی ذاتِ گرامی کا یہی پہلو سب سے زیادہ اہم اور شاندار ہے اور اس پہلو پر اب سے پہلے محققین نے سب سے کم توجہ دی تھی، میں اس کوشش میں کہاں تک کامیاب ہوا ہوں اس کا اندازہ آپ لگا سکتے ہیں۔

مجھے نہایت مسرت ہے کہ آپ علامہ کے "سفرِ دکن" سے متعلق ایک کتاب ترتیب دے رہے ہیں۔ اگرچہ اس سے قبل "اقبال اور حیدرآباد دکن" کے نام سے یہاں ایک کتاب شائع ہو چکی ہے جو نظر حیدرآبادی صاحب نے مرتب کی تھی، لیکن اگر آپ اس موضوع پر زیادہ تحقیق اور تجسس سے کام لے رہے ہیں تو "ماہرینِ اقبال" اس مضمون کی ایک زیادہ جامع اور مکمل کتاب کا مطالعہ کر سکیں گے۔

مجھے افسوس ہے کہ فاصلے کی طوالت اور سفر کی مشکلات نے اس بات کا امکان باقی نہیں رکھا کہ مخطوطات، تصاویر وغیرہ کی صورت میں آپ کے پاس جو نوادر موجود ہیں ان کی زیارت سے اپنی آنکھیں روشن کر سکوں۔ بہرحال آپ کی مخلصانہ دعوت کا بہت بہت شکریہ!

آپ یہ سن کر مسرور ہوں گے کہ میں نے اپنی کراچی کی قیام گاہ میں حال ہی میں علامہ کے ذاتی استعمال کی بہت سی اشیاء، تاریخی نوادر کی صورت میں محفوظ کر رکھی ہیں اور اس امر کا انتظام کیا ہے کہ شائقین انھیں دیکھ سکیں کہ اپنے دور کی اس عظیم شخصیت لباس اور ذاتی ضروریات کے معاملے میں قلندری اور فقیری کا کتنا بڑا نمونہ تھی۔

آپ یقیناً یہ خبر بھی دلچسپی سے سنیں گے کہ میں آج کل علامہ کی زندگی اور شاعری پر ایک رنگین دستاویزی فلم بنا رہا ہوں جو غالباً ۹۰ منٹ میں ان کی زندگی کے تمام گوشوں کی ترجمانی مکمل کر دے گی۔ اسے ایک شاہکار علمی فلم بنانے کے لئے انگلستان بھیج کر رنگین کرایا گیا ہے۔ میسور اور مدراس کی تصاویر بھی اس میں شامل ہیں۔

آپ نے چودھری محمد حسین مرحوم کی جس مجوزہ کتاب "سفرنامہ جنوبی ہند" کا تذکرہ کیا ہے، میرے علم میں چودھری صاحب کی ایسی کوئی کتاب نہیں جو شائع ہوئی ہو البتہ آپ روزنامہ "انقلاب" کے مضامین کے متعلق مولانا غلام رسول مہر (مسلم ٹاؤن لاہور) کے پتہ پر خط لکھ کر تحقیق فرمالیں۔

اگر کتابوں کی ترسیل اور وصولی شرح صاف ہونے کے بارے میں اطمینان ہو جائے تو میں "روزگارِ فقیر" کی دونوں جلدیں آپ کو ضرور ارسال کر دوں گا۔ آپ نے جس خلوص و محبت کے جذبے سے خط لکھا ہے اس کے لئے بیحد مشکور ہوں۔

نیازمند

فقیر سید وحید الدین

میں نے اس خط کے جواب میں ایک اور خط لکھنے کی سعادت و مسرت حاصل کی۔ راقم نے روزگارِ فقیر سے متعلق بھی اپنی ناقص رائے لکھی اور اپنے البم کے لئے تصویر بھی مانگی اور سلطان ٹیپو کی تحریر[1] کا ایک حقیر تحفہ بھی روانہ کیا جس پر وہ کافی خوش ہوئے، دوسری جلد سے علامہ اقبال کی کچھ نقلیں بھی اپنے مضمون میں اخذ کرنے کی اجازت مانگی تھی۔ فقیر صاحب نے بزرگانہ شفقت و کرم کے ساتھ تصویر روانہ کرتے ہوئے لکھا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الفقر فخری

۴۳۔ روز اسٹریٹ
میکلوڈ روڈ۔ کراچی کینٹ
۲۷ر اگست ۷۷ء

مکرمی سلیم صاحب تمنائی!

سلام مسنون

امید ہے آپ بفضلِ خدا بخیریت ہوں گے۔

آپ کا خط موصول ہوا۔ انتہائی خوشی ہوئی۔ آپ نے جن الفاظ میں "روزگارِ فقیر" کو سراہا ہے، میں اس کے لئے تہِ دل سے مشکور ہوں۔ آپ کی تحریر سے آپ کی بلند نظری عیاں ہے۔ آپ کی تحریر سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کو "روزگارِ فقیر" حصہ اول پڑھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ اس میں بھی اہم واقعات درج ہیں۔

مجھے کبھی بھی تصویر اتروانے کا شوق نہیں رہا۔ محض آپ کے خلوص اور اصرار پر ایک تصویر جس پر اپنے دستخط بھی ثبت کر دئے ہیں روانہ کر رہا ہوں۔

سلطان ٹیپو کی تحریر کا جو تحفہ آپ نے ارسال کیا ہے انمول سرمایہ ہے جو میرے خاندان میں آئندہ نسلوں کے لئے محفوظ رہے گا۔ علامہ مرحوم سے عقیدت کے لئے "روزگارِ فقیر" جلد اول اور "اقبال ان پکچرز"[2] بھجوا رہا ہوں۔ سلطان ٹیپو کی تصویر کا مقصد اس سے پورا ہو جائے گا کیونکہ اس کتاب میں علامہ مرحوم کی زندگی کا مکمل نقشہ نادر تصاویر میں

---

[1] اس میں سلطان کی مہر اور دستخط بھی تھے۔ بطور خاص طور پر سلطان کے ہاتھ سے لکھی ہوئی بسم اللہ ببر کی شکل کی تھی۔ سلطان کو شیر سے مناسبت تھی۔ وہ شیر کو بہت پسند کرتا تھا۔ ببر کا نشان اکثر ہتھیاروں اور خاص اس کے مقبرہ میں بھی ہم پاتے ہیں۔ بسم اللہ کے حروف میں بھی یہی نشان نمایاں ہے۔

[2] روزگارِ فقیر جلد دوم میں علامہ اقبال کی ایک تصویر چھپی ہے جس میں علامہ کو مزار ٹیپو کے قریب بہ تاسف کھڑا دکھایا گیا ہے۔ میں نے اس کی نقل مانگی تھی۔

دیا گیا ہے۔

"روزگارِ فقیر" جلد دوم میں شامل ڈاکٹر صاحب کی جو نظمیں بچوں کے لئے منتخب کرنا چاہیں بڑی خوشی سے لے لیں۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے، علامہ مرحوم کے کلام کا مقصد یہی ہے۔ ان کا پیغام صرف مسلمانوں ہی کے لئے مخصوص نہیں ہے بلکہ تمام افراد نسلِ انسانی کے نام ہے۔ اس کو تجارتی منفعت کے تحت نہیں لانا چاہئے۔

آخر میں میری یہ ضرور استدعا ہے کہ آپ اقبالیات پر میری ان کتابوں سے مواخذہ کر کے جو جو کتاب بھی شائع کریں اس میں اس کتاب کا حوالہ ضرور درج فرمائیں، یہ ضروری ہے امید ہے میری استدعا کو آپ ملحوظ خاطر رکھیں گے۔ محترم پروفیسر سید نذیر احمد صاحب سے میرا سلام کہہ دیں۔

آپ کا نیاز مند

فقیر سید وحید الدین

کسی کے یا کسی چیز کے انتظار میں کسی کو مزہ ملے تو ملے مگر مجھے ہمیشہ تکلیف ہوئی ہے۔ کتابوں کا انتظار رہا، مزہ نہیں ملا، تکلیف ہوئی۔ کسی چیز میں غیر معمولی تاخیر ہو جاتی ہے یا خط آنے سے رہ جاتا ہے تو مایوسی یا صبر کی بات زبان سے نکل ہی جاتی ہے۔ مجبوری کا نام صبر ہوا۔ مگر اس صبر میں بھی انتظار کی دبی چنگاریاں کبھی کبھی ضرور روشن ہو جاتیں۔ معاملہ کچھ دلچسپی اور آگ کا سا تھا۔ ڈاکیے نامہربان نہ تھے ورنہ ان کو دشمن سمجھتا۔ دل ہی دل میں گالیاں دیتا۔ غرض تھک ہار کر سوچا کہ خط لکھوں۔ گلہ کروں بچوں کی طرح ضد کروں۔ مگر یار لوگوں نے ایک زندہ بات کو جو مسجد کے زیرِ سایہ نہیں بلکہ قریب ہے، دیر و حرم کا آدمی سمجھ، بزرگوں کا واسطہ یا حوالہ (شاید غیرت دلانے کے لئے) دے محراب میں نہیں بٹھایا اور کھڑا کیا بلکہ اس کے انتظامی امور ہاتھ میں دے دیئے اور کہا (یا میں نے یا میرے دل نے اس کا مطلب یوں نکال لیا) کہ آپ جو کچھ ہیں وہ ہیں، من تو شدم نہیں آتا، تن اجلا ہے، سمجھا جنگا ہے، لہٰذا آپ کے بزرگوں نے یہ عنایت کی تھی، اب آپ سنبھالئے

ہم چین کی بانسری بجاتیں، اور اپنے گھر تان کر، گھوڑے بیچ یا مردوں سے بازی لگا سوئیں۔

جب کوئی تعریف منہ پر کر دے تو گرم بھی نرم ہو جاتا ہے ہم بھی نرم ہوئے ویسے گرم کبھی نہیں رہے لیکن حال پتلا ضرور ہوا، یعنی رمضان شریف آئے اور ہم لکھنے لکھانے، پڑھنے پڑھانے کے معاملے میں کچھ بیکار سے ہو گئے، طلبہ بھی روزے رکھتے تھے اس طرح وہ اپنے آپ پڑھنے سے بچنے اور افطاری کے انتظار میں سونے کے زیادہ قائل تھے، اور جو رمضانی نہیں تھے وہ ہم پر ترس کھا کر بھی فلم کا پروگرام بنا دیتے اور گھر میں والدین منکر نکیر کا روپ دھار کر پوچھ تاچھ کرتے تو استادِ محترم کا نام نامی اسمِ گرامی لے دیتے۔ مقتدی کا سارا گناہ امام کے سر۔ اس بیچ محمد طفیل صاحب المعروف بہ محمد نقوش نے ہمیں پہلی بار خطوط نمبر کے سلسلے میں خط تحریر فرمایا۔ ہم پر ترس نہ کھانے کی بات لکھی اور محترم رفعت صاحب کو بھی لکھا۔ وہ بھلا کب ترس کھانے معاملہ چکی کے دو پاٹ اور بیچ اس کے دانے کا سا تھا۔ ہم نے تراویح کے بعد صبح مضمون میں سحر کی۔ مضمون تیار تھا۔ ساتھ ہی ساتھ مصنف روزگارِ فقیر کے خط بھی۔

ایک دن جب گھر لوٹے تو جانی پہچانی تحریر کا لفافہ نظر آیا لیکن بھارت کے ٹکٹ لگے ہوئے تھے، ہم ہند و مسلم اور گھڑی والی کی دو ادبی بیٹیوں کے ملاپ کی طرح اس پر بھی خوش ہو گئے اور بعد میں یہ دعا آرزو کی صورت میں دل سے نکلی کہ اتحاد و ملاپ پیار محبت ان دو بہنوں میں بھی ہو جنہیں ہم ہند و پاک کہتے ہیں۔

کرم نامہ اپنے بزرگ محترم فقیر وحید الدین صاحب کا تھا۔ جو بنگلور سے آیا تھا مگر وہ کراچی ہی میں تھے۔ دراصل اس کے بھیجنے والے جناب عبدالغفور صاحب بنگلوری تھے اور محترمی عبدالعزیز بنگلوری ڈپٹی مینیجنگ ڈائرکٹر نیشنل بنک آف پاکستان کے حسنِ توسط سے فقیر صاحب تک ان کی رسائی ہوئی تھی۔ اور ان ہی کے ہاتھوں روزگارِ فقیر کی دونوں جلدیں اور "اقبال ان پکچرز" البم روانہ کیا تھا۔

میں بنگلور جا نہ سکا۔ عزیزی نعیم اقبال نے ان سے بڑا در

زیب غوری

غزل

کمرے کی ہر الماری کتابوں سے بھری ہے
ہر سمت روایات کی دیوار کھڑی ہے

ممکن ہے، آیا ہو کا کہے اندر کا دربار
یا در مرا گھر ہے کہ کوئی دھوپ کھڑی ہے

بستر پہ مرے چاندنی سوتی ہے اکیلی
یا گردش لیتی کوئی آوارہ پری ہے

کب فصل گلابوں کی زمینوں سے اُگے گی
مدت سے مری روح میں تلوار گڑی ہے

مانیں گے نہ ہم زیب کے اس رنگِ سخن کو
زندہ رہیں جن لوگوں نے یہ بات کہی ہے

حاصل کرکے ہم تک پہنچائے۔ شکریہ کے لئے میرے پاس کوئی الفاظ نہیں ہے۔

آپ نے اس آخری خط میں دوبارہ میرے ناچیز ترین تحفے کا شکریہ ادا کرکے مجھے شرمندہ کیا تھا، لکھا تھا:

۱۸-۱-۱۹۶۸ء

مکرمی و محترمی سلیم تمنائی صاحب

السلام علیکم۔

آپ کا عنایت نامہ اور سلطان ٹیپو شہید کی تحریر کا نادر عکس موصول ہوگیا تھا۔ آپ کے اس پرخلوص ہدیے کے لئے سراپا تشکر ہوں۔ اور اس قیمتی نوشتے کو نہایت حفاظت سے رکھوں گا۔ تاکہ میری زندگی میں اور اس کے بعد میرے جمع کردہ نوادر میں شائقین علم و اسلاف اس بطل جلیل کے انداز تحریر سے بھی اپنی آنکھیں روشن کرتے رہیں۔

آپ کے ارشاد کے مطابق میں نے آپ کی لائبریری کے لئے اسی وقت مطلوبہ کتب ارسال کرنے کی کوشش کی تھی لیکن ہندوستان کے ساتھ رجسٹری پارسل کا سلسلہ ڈاک منقطع ہونے کے سبب یہ ارادہ پورا نہ ہوسکا۔

اب حسن اتفاق سے میرے عزیز و محترم دوست جناب ایس۔ کے۔ عبدالعزیز ڈپٹی چیف منیجنگ ڈائرکٹر نیشنل بنک آف پاکستان کے دوست نجی دورہ پر بنگلور آ رہے ہیں۔ میں نے اس خواہش کا ذکر کیا تو ازراہ عنایت انھوں نے یہ کتب اپنے ساتھ لے جانے اور آپ کو پہنچانے کی ذمہ داری قبول کرلی ہے۔ چنانچہ ان کے ذریعے آپ کی لائبریری کے لئے "اقبال ان پکچرز" اور روزگار فقیر جلد اول و جلد دوم کی ایک ایک کاپی روانہ کر رہا ہوں۔

جب یہ تینوں کتابیں آپ کو مل جائیں تو آپ مجھے اطلاع ضرور دیں۔ نیز ان کتابوں کے بارے میں اپنی قیمتی رائے سے بھی آگاہ فرمائیں۔

امید ہے کہ آپ مع اہل و عیال بخیر و عافیت ہوں گے۔

آپ کا نیازمند

فقیر سید وحید الدین

میں نے حکم کی تعمیل میں رسید روانہ کردی۔ ڈھیر وں شکریہ ادا کیا۔ پھر میں اپنی تعلیمی مصروفیات میں کھو گیا۔ میری اور اہلیہ کی بیماریوں میں خیر قاضی کا حال پتلا ہوا، داڑھ چلے ستر بلائے کے محاورے میں تبدیلی ہوئی اور داڑھ جلے بابا بنے پر معاملہ آگیا۔ عقل داڑھ ہمیشہ بے وقوف ہوتے ہیں یا کم از کم ہمارا تجربہ یہی ہے۔ نہ جانے کب چپکے سے براجمان ہوگئے بتیسی کے جز و بن گئے۔ اب ان کی عقل میں فزوں خود آگیا تھا ہماری عقل بھی ٹھکانے لگادی، اور والدہ محترمہ کا آپریشن، ہماری سب سے بڑی پریشانی تھی۔ اللہ کی عنایات سے بھی ہم کچھ زیادہ ہی قائل تھے اور ہیں۔ معاملات سدھرے لیکن ہم دوست و احباب سے کچھ دنوں کے لئے کٹ کر رہ گئے۔ بزرگوں دوستوں اشاگردوں وغیرہ کو خط لکھنے کی سوچ ہی رہے تھے کہ جیسے قلم میں طاقت نہ رہی۔ ہماری زبان "علی گڑھ" نے "قومی آواز" سے خبر اخذ کی تھی کہ: "لاہور۔ ۲۲ر جولائی، اردو کے ایک ممتاز ادیب کرنل فقیر وحید الدین کا انتقال گذشتہ اتوار کو کراچی میں ہوگیا۔ مرحوم لاہور کے مشہور فقیر خاندان کے بزرگ تھے۔ انھوں نے علی گڑھ میں تعلیم حاصل کی۔ شاعر مشرق علامہ اقبال سے دیرینہ نیازمندی اور گہری عقیدت کی بنا پر انھوں نے علامہ کی زندگی اور افکار پر "روزگار فقیر" اور "اقبال ان پکچرز" مرتب کرکے شائع کیا۔ انھوں نے حال ہی میں جناب فیض احمد فیض کے تعاون سے اقبال کی تعلیمات پر ایک فلم بھی تیار کی تھی۔ سیرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ان کی کتاب محسن اعظم بھی مقبول ترین کتابوں میں ہے۔ انھوں نے اپنے نامور ہم عصروں کے سوانحی خاکوں پر مشتمل ایک ادبی شاہکار انجمن کے نام سے تصنیف کیا۔"

فقیر صاحب سے میرا کوئی رشتہ نہیں تھا اور نہ انھیں کبھی دیکھا تھا۔ میری اور ان کی دوستی کی ساری کائنات ان کے تین خطوط اور تین کتابیں تھیں، لیکن ایسا محسوس ہوا کہ دوبارہ میرے والد مرحوم اور تایا مرحوم کا وصال ہوا ہے۔ بلا مبالغہ اتنا ہی غم ہوا اب ایسے بزرگ مشکل سے ملیں گے۔ ان کی شفقت و مروت اور محبت کا ادنی کرشمہ یہ ہے کہ راقم ہزاروں میل دور رہ کر بھی بے چین ہے اور آنکھیں غم کے موتی رول رہی ہیں مغفرت کے لئے دعا کے جملے بھی زبان سے نہیں نکل رہے ہیں۔ دل جب روئے تو ہونٹ صرف پھڑک کر رہ جاتے ہیں اور آنکھیں اپنا غم چھپانے دل اور ہونٹ کو بظاہر "دیانت" کہہ کر رو پڑتی ہیں اور جواب میں ہونٹ مسکراتے ہیں۔ جیسے وہ بڑے باہمت ہوں لیکن دل رازداں ہے وہ کہتا ہے کہ اس مسکراہٹ کے پیچھے چھپے غم کو میں جانتا ہوں۔ ہاں جانتا ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور وہ خود رو پڑتا ہے۔

مراسلات

روہیلکھنڈ اخبار کے بارے میں

میں آپ کی توجہ اس غلط فہمی پیدا کرنے والی خبر کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں جو ہماری زبان کی حالیہ اشاعت میں شائع ہوئی ہے کہ روہیلکھنڈ اخبار بند ہوگیا ہے۔ اخبار کی مسلسل کاپیوں کی وصولی سے آپ کو یقین ہوگا کہ یہ صرف زبان کی تبدیلی ہے۔ اخبار کے بند ہونے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ تبدیلی اخبار کے ۱۵ راگست ۱۹۶۸ء کے شمارہ پر پریس ایکٹ کی بنا پر ضروری سمجھی گئی عدالت میں مسلسل طویل مقدمات کی وجہ سے ہم کو یہ یقین کرنا پڑا کہ اردو میں سیاسی موضوعات پر اظہار خیال کرنا ہمارے لئے نقصان دہ ہے۔ چنانچہ تبدیلی کی بنیادی وجہ یہی ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ اپنے اخبار کی قریبی اشاعت میں صحیح صورت حال کی وضاحت فرمادیں گے۔

(ریتج بہادر سنہا)

یہ اشعار کس کے ہیں؟

ذیل میں چند مصرعے درج کر رہا ہوں قارئین "ہماری زبان" سے استدعا ہے کہ اگر ان کی نظر میں یہ اشعار ہوں تو "ہماری زبان" کے ذریعہ شاعر کا نام تحریر فرماکر ممنون کرم فرمائیں۔

یاران ہمنشیں و رفیقان و دستدار
سب آشنا ہیں زندگی مستعار کے
حب مندگئی یہ آنکھ تو پھر دوست جو ہر تک
آتا ہے پاس کون کسی کے مزار کے

(انجم)

غالب صدی

یکم ستمبر کے ہماری زبان میں مندرجہ بالا عنوان سے ڈاکٹر ابو محمد سحر صاحب کا مراسلہ شائع ہوا ہے موصوف نے سینٹنری کے لئے صدی کا لفظ نہایت معقول تجویز کیا ہے۔ پیدائش صدی اور وفات صدی بھی پوری طرح قابل قبول ہیں۔ صد سالہ سالگرہ اور صد سالہ برسی میں یہ بات نہیں پیدا ہوئی۔ کیونکہ یہ الفاظ سینٹنری کے بجائے ANIVERSARY کے لئے موزوں ہیں۔ ان سے صرف سینٹنری کے لئے کوئی لفظ نہیں ملتا۔ سینٹنری اشخاص کے علاوہ اداروں محکموں، اخباروں اور رسالوں وغیرہ کی بھی ہوتی ہے۔ صدی کا لفظ ہر صورت میں موزوں رہے گا اور جیسا کہ سحر صاحب نے لکھا ہے اس سے ہر قسم کے مرکبات حاصل کئے جاسکتے ہیں۔ اس لفظ کے چلن کے لئے ضروری ہے کہ غالب کی سو ویں برسی کی تقریبات کے سلسلے میں جو کمیٹیاں قائم ہیں وہ اردو میں اپنا نام غالب صدی کمیٹی یا غالب صدی تقریبات کمیٹی استعمال کریں حسب موقع وفات صدی کا بھی استعمال کیا جائے۔

(عبدالرشید)

میں کچھ نہیں کہتا

۸ر ستمبر ۱۹۶۸ء کے ہماری زبان میں پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب صاحب کا ایک مراسلہ بہ عنوان "کیا کہا میں نے آپ کیا سمجھے" شائع ہوا ہے۔ اس مراسلے میں چونکہ آں محترم نے یہ ظاہر کیا ہے کہ میں نے اپنے ایک مضمون مطبوعہ صحیفہ (جولائی ۱۹۶۸ء لاہور) میں ان کے مضمون کا ایک غلط حوالہ درج کر دیا ہے اس لئے میری طرف سے اس کی وضاحت ضروری ہوجاتی ہے۔

میں نے اپنے مضمون میں لکھا تھا کہ گلزار نسیم کا اصل ماخذ "مثنوی باغ بہار" ہے اور مثنوی کے مصنف ریحان الدین ریحان لکھنوی ہیں اسی کے ساتھ ہماری زبان بابت ۱۵ر جنوری ۱۹۶۱ء اور یکم فروری ۱۹۶۱ء کے حوالے دے کر یہ بھی لکھا تھا کہ مثنوی باغ بہار کے مصنف ریحان الدین لکھنوی کو منشی دیا کرشن ریحان لکھنوی خیال کرنا صریحاً غلط ہے۔ مسعود حسن رضوی صاحب ادیب کا کہنا ہے کہ انھوں نے اپنے مراسلہ مطبوعہ یکم فروری ۱۹۶۱ء میں مثنوی باغ بہار کے مصنف کو دیا کرشن ریحان ظاہر نہیں کیا بلکہ صحیفہ کے مقالہ نگار نے بے سبب ایک غلطی ان سے منسوب کردی۔

رضوی صاحب میرے بزرگ و محترم ہیں۔ اس لئے میں اس کے جواب میں کچھ نہیں کہتا۔ ہاں رضوی صاحب کے جس مراسلے کا حوالہ میں نے دیا ہے اس کی نوعیت اور پس منظر پر مختصراً روشنی ڈالنا ضروری ہے۔ تاکہ ہماری زبان کے قارئین خود سمجھ لیں کہ رضوی صاحب نے فی الواقع کیا لکھا ہے اور میں نے کیا سمجھا ہے۔

رضوی صاحب کے مراسلہ مطبوعہ یکم فروری ۱۹۶۱ء (جس کا حوالہ میں نے دیا ہے) کا پس منظر یہ ہے کہ "ہماری زبان میں گلزار نسیم کے ماخذ پر بحث چل رہی تھی اور رضوی صاحب کے مراسلے سے پہلے ڈاکٹر گیان چند صاحب نے گلزار نسیم کے ماخذ کے عنوان سے ۲۲ر اکتوبر ۱۹۶۰ء کے ہماری زبان میں رفعت کی فارسی اور ریحان لکھنوی کی اردو مثنوی باغ بہار کا ذکر کیا تھا لیکن ساتھ ہی یہ بھی لکھ دیا تھا کہ رفعت و ریحان کے متعلق انھیں تذکروں سے کوئی معلومات فراہم نہ ہوسکی۔

ڈاکٹر گیان چند کی مذکورہ بالا تحریر کے پیش نظر سراج دھولپوری صاحب نے ۱۵ر فروری ۱۹۶۱ء کی ہماری زبان میں "رفعت و ریحان" کے عنوان سے ایک مراسلہ شائع کرایا جس میں انھوں نے ریحان لکھنوی کے متعلق لکھا۔

"ریحان کا نام دیا کرشن اور لقب بخشی تھا رہنے والے لکھنؤ کے تھے نواب واجد علی شاہ کے بخشی الملک .... راجہ الفت رائے کے یہاں سررشتہ داری کے عہدے

پر فائز تھے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ منشی دیبی پرشاد نے ریحان کو کاستھ سری واستو بتایا ہے۔ پہلے سخن کے شاگرد تھے ازاں بعد لالہ موتی رام سے مشورہ سخن کرتے تھے۔۔۔۔ ۔۔۔۔۔۔ وقت انطباع آثار الشعرائے ہنود، ریحان دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔ تذکرۂ مولد میں ان کے چالیس بیتالیس اشعار بھی منقول ہیں۔"

مندرجہ بالا عبارت میں سراج دھولپوری صاحب واضح طور پر دیا کرشن ریحان لکھنوی کو مثنوی باغ بہار کا مصنف سمجھ رہے ہیں۔ ڈاکٹر گیان چند اور سراج دھولپوری کی تحریروں کو دیکھنے کے بعد پروفیسر مسعود حسن رضوی صاحب نے "گل بکاولی کا ایک اور قصہ" کے عنوان سے یکم فروری ۱۹۶۱ء کے ہماری زبان میں ایک مراسلہ شائع کیا جس میں انھوں نے تین شقوں میں علی الترتیب تحریر فرمایا۔

(۱) "۱۵ر جنوری ۱۹۶۱ء کے ہماری زبان میں جناب سراج دھولپوری صاحب کا ایک مراسلہ شائع ہوا ہے جس میں موصوف نے فارسی اور اردو کی ان کتابوں کی نشان دہی کی ہے جن میں گل بکاولی کا قصہ بیان کیا گیا ہے۔ ان کتابوں کے علاوہ اس پر ایک اور کتاب میرے علم میں ہے، نام اس کتاب کا "گل باغ بہار" ہے اور مصنف اس کے محمد اودعلی نادان حیدرآبادی ہیں۔"

(۲) منشی دیا کرشن لکھنوی کا قطعہ، لاجواب زیر نظر مراسلے میں آثار الشعرائے ہنود سے نقل کیا گیا ہے جو حسب ذیل ہے۔۔۔۔۔۔۔۔ مدت ہوئی مجھ کو یہ قطعہ کہیں حسب ذیل صورت میں ملا تھا اور اسی صورت میں میں نے اپنی کتاب ہماری شاعری میں نقل کیا ہے۔۔۔۔۔۔۔ اور یہی صورت بہتر معلوم ہوتی ہے۔"

(۳) اس مراسلے میں تین جگہ اودھ کے آخری فرماں روا واجد علی شاہ کا نام آیا ہے اور ہر جگہ ان کے نام کے ساتھ نواب کا لفظ لکھا گیا ہے، یہ غلط ہے۔۔۔۔ واجد علی شاہ، بادشاہ تھے۔"

مذکورہ بالا مراسلے میں رضوی صاحب نے سراج دھولپوری کے مراسلے کی بعض کمزوریوں کی نشان دہی کی ہے، بعض غلطیاں درست کی ہیں اور بعض جگہ سراج صاحب کی بہم پہنچائی ہوئی معلومات پر اضافہ کرنے کی کوشش کی ہے تاہم ریحان لکھنوی کے قطعہ کے سلسلے میں، لیکن ریحان کے سلسلے میں انھوں نے جو کچھ لکھا ہے اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ وہ جو کچھ لکھ رہے ہیں سراج دھولپوری کی تائید میں لکھ رہے ہیں اور سراج دھولپوری کی طرح، دیا کرشن ریحان لکھنوی کو مثنوی باغ بہار کا مصنف سمجھ کر لکھ رہے ہیں۔ اگر ایسا نہیں تھا تو پھر انھیں دیا کرشن ریحان اور ان کے قطعہ کے متعلق مزید معلومات بہم پہنچانے کے بجائے سراج دھولپوری کے بیان کی تردید کرنی چاہیے تھی۔ لیکن موصوف نے ایسا نہیں کیا۔ اگر رضوی صاحب کو مراسلہ لکھتے وقت یہ علم ہوتا کہ مثنوی باغ بہار کے مصنف ریحان لکھنوی اور دیا کرشن ریحان لکھنوی دو الگ الگ شخصیتیں ہیں تو وہ ہرگز سراج دھولپوری کی غلط اطلاع پر مزید اطلاع کا اضافہ نہ فرماتے۔

رضوی صاحب اپنے مراسلے میں سراج دھولپوری صاحب کی اس معمولی بات پر گرفت تو کرتے ہیں کہ انھوں نے واجد علی شاہ کے نام کے ساتھ "نواب" کیوں لکھ دیا لیکن جہاں سراج دھولپوری نے ایک صریح واقعاتی غلطی کی ہے وہاں رضوی صاحب تصحیح کرنے کے بجائے، ان کی غلطی کو مزید طول دیتے ہیں کیا اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ رضوی صاحب کو مراسلہ لکھتے وقت فی الواقع یہ خبر نہیں تھی کہ گلزار نسیم کے ماخذ مثنوی باغ بہار کا اصل مصنف کون ہے۔ ریحان الدین ریحان لکھنوی یا دیا کرشن ریحان لکھنوی۔

مندرجہ بالا تصریح کی روشنی میں ہماری زبان کے قارئین بخوبی اندازہ کرسکتے ہیں کہ میں نے اپنے مضمون مطبوعہ صحیفہ میں رضوی صاحب کا جو حوالہ دیا ہے وہ کس حد تک صحیح یا غلط ہے اور رضوی صاحب کا احتجاجی مراسلہ مطبوعہ ۸ر ستمبر ۶۸ء جس کے پیش نظر مجھے یہ سطور لکھنی پڑیں کس حد تک درست ہے۔ اس پر بھی اگر رضوی صاحب کو اصرار ہے کہ میں نے غلط حوالہ دیا ہے تو میں ان کے احترام میں خاموش ہوا جاتا ہوں اور کچھ نہیں کہتا۔

(فرمان فتحپوری)



انجمن ترقی اردو راجستھان کے وفد کی ملاقات

جے پور۔ شہر جے پور کے ستولی کرہ بازار سکنڈری اسکول میں اردو کے طلبہ کی تعداد چالیس سے زائد ہے۔ جہاں اردو کی تعلیم بحیثیت اختیاری مضمون تو جاری ہے۔ مگر تھرڈ لنگویج کے لحاظ سے صرف سنسکرت ہی جاری ہے۔ اس لیے اردو کے طلبہ کو بھی تھرڈ لنگویج کی حیثیت سے سنسکرت لینے پر مجبور ہیں۔ جو ان کے لئے بہت مشکل مضمون ہو جاتا ہے۔ اگرچہ اس میں نہ پاس ہونا ضروری ہے۔ نہ اس پرچے کے نمبر شمار ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے اس صورت میں اس کی تعلیم کا معیار اور نتیجہ کیا ہوگا۔ لہٰذا انجمن ترقی اردو راجستھان کا ایک وفد جو حسب ذیل اصحاب پر مشتمل تھا ہیڈ ماسٹر صاحب اسکول مذکور سے ملا۔ انھوں نے یقین دلایا کہ آئندہ سیشن سے لازمی طور پر اردو کو بھی تھرڈ لنگویج کے لحاظ سے جاری کرانے کی کوشش وقت پر ضرور کی جائے گی۔ انھوں نے موجودہ سیشن میں اساتذہ کی تقرری سے اس لئے معذوری کا اظہار کیا کہ تین ماہ گزر چکے ہیں اور بورڈ کی منظوری کے بغیر درجہ کا اجرا ممکن نہیں ہے اور منظوری آنے میں جتنا وقت لگے گا۔ اس کے بعد کوئی گنجائش تعلیم باقی نہ رہے گی

(ناصر نشاط)

انجمن ترقی اردو جودھپور کی مجلس عاملہ کا جلسہ

انجمن ترقی اردو جودھپور کی مجلس انتظامیہ کا اجلاس زیر صدارت جناب شیام لال صاحب شرما R.A.S بتاریخ ۲۳ر ستمبر ۱۹۹۸ء شام کو ۵ بجے منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں حسب ذیل کارروائی عمل میں آئی۔ (۱) جنرل سکریٹری نے سابقہ اجلاس کی کارروائی پڑھ کر سنائی جو منظور کی گئی۔ (۲) باتفاق رائے یہ طے ہوا کہ اردو گھر دہلی کی تعمیر کے سلسلے میں مبلغ دو سو روپیہ ارسال کئے جائیں اور انجمن ترقی اردو ہند کو تحریر کر دیا جائے کہ اس وقت اسلامیہ سکنڈری اسکول جودھپور کی تعمیر کے لئے چندہ فراہم کیا جا رہا ہے لہٰذا یہ مناسب نہیں ہے کہ اردو گھر دہلی کے لئے چندہ فراہم کیا جائے۔ اسکول کے مکمل ہو جانے کے بعد اس مسئلہ پر غور کیا جائے گا۔ (۳) جنرل سکریٹری نے گذشتہ میں سوائی جے سنگھ اردو ریڈنگ روم جے پور کو بہت امداد انجمن کی جانب سے مبلغ سو روپیہ ادا کئے تھے اس کی توثیق کی گئی۔ (۴) باتفاق رائے غالب کی صد سالہ برسی کے لئے ایک سب کمیٹی کی تشکیل کی گئی۔

(وحید اللہ خاں سکریٹری)

انجمن اردوئے معلّیٰ کی ادبی نشست

بھوپال: سیفیہ کالج کے ایم۔اے (اردو) کے طلبہ کی انجمن "اردوئے معلّیٰ" نے ایک مختصر سی ادبی نشست کا اہتمام کیا نشست کا آغاز مشیر انجمن پروفیسر عبد القوی دسنوی صاحب کی تقریر سے ہوا موصوف نے سیفیہ کالج کے شعبۂ اردو کی سرگرمیوں کا تذکرہ فرمایا ایم۔اے (اردو) کلاسز کے قیام کے سلسلہ میں پیش آمدہ مشکلات، ادارہ سیفیہ کالج کی ہمت افزائی اور بالآخر مستحکم بنیادوں پر اس شعبہ کے قیام نیز طلبہ کی غیر معمولی دلچسپی کا مختصر جائزہ پیش کیا۔ پروفیسر موصوف نے انجمن اردوئے معلّیٰ کے اغراض و مقاصد پر بھی روشنی ڈالی اور کہا کہ انجمن کی علمی و ادبی نشستوں کے ذریعہ طلبہ کے ذوق کو نکھارنا اور شعور کی راہیں روشن کرنا مقصود ہے۔ اس انجمن کے زیر اہتمام منعقد کی جانے والی ادبی نشستوں میں ممتاز دانشوروں، فنکاروں، ادیبوں اور فنکاروں کو مدعو کیا جاتا ہے اور وہ مختلف موضوعات پر اظہار خیال فرماتے ہیں موضوعات کے انتخاب میں اس امر کا خصوصاً خیال رکھا جاتا ہے کہ یہ درسی اعتبار سے بھی طلبہ کے لئے مفید ثابت ہوں۔ بعد ازاں معتمد بزم متین الرحمٰن صاحب نے نشست کے مہمان مقرر پروفیسر پرمود بہاری لال یکتا (شعبۂ انگریزی، موتی لال وگیان مہاودیالیہ بھوپال) کا تعارف حاضرین جلسہ سے کرایا۔ اس کے بعد پروفیسر یکتا نے انگریزی ادب میں رومانی تحریک اور اس کا اردو ادب پر اثر" کے موضوع پر تقریر فرمائی۔ آخر میں نائب صدر انجمن جناب محمد یوسف صاحب نے مہمان خصوصی کا شکریہ ادا کیا۔ اس نشست میں ایم۔اے (اردو) کے طلبہ اور اساتذہ نے بھی شرکت فرمائی۔ (متین الرحمٰن)

انجمن فارسی اسلامیہ کریمیہ ڈگری کالج اندور کا جلسہ

اسلامیہ کریمیہ ڈگری کالج کی انجمن فارسی کا افتتاحی جلسہ کالج کی مجلس انتظامیہ کے صدر جناب خورشید حسن خاں صاحب کی صدارت میں منعقد ہوا۔ جناب عتیق حنفی پروگرام ایگزیکٹو آل انڈیا ریڈیو اندور مہمان خصوصی تھے۔ جلسہ میں عذرا جعفری، نعمان علی معصوم اور محمد طارق نے اپنی تخلیقات پیش کیں۔ مہمان خصوصی جناب عتیق حنفی صاحب نے فارسی زبان کے تاریخی سفر پر عالمانہ بصیرت کے ساتھ پر مغز تقریر فرمائی۔ پروفیسر عادل جعفری صاحب نے شرکاء جلسہ کا شکریہ ادا کیا۔ (سکریٹری)

سیفیہ کالج بھوپال میں آنند نرائن ملا کا بیان

۸ر اکتوبر ۱۹۹۸ء کو شب میں آنند نرائن ملا سیفیہ کالج (بھوپال) تشریف لائے اور شعبۂ اردو میں تقریباً ۴۵ منٹ تک اردو اور دوسرے موضوعات سے متعلق گفتگو کی۔ جناب عبد القوی دسنوی نے شعبۂ اردو کا تعارف کرایا اور اس کی مطبوعات ان کی خدمت میں پیش کی۔ جناب آنند نرائن ملا نے حسب ذیل تحریری تاثرات کا اظہار کیا۔ اس ملک میں مردم شماری کے اعداد و شمار کے اعتبار سے اردو بولنے والوں کی تعداد قریب پونے تین کروڑ افراد کی ہے غالباً بولنے والے اس سے کافی زائد ہیں کیونکہ میرا نام ہندی بولنے والوں میں لکھ دیا گیا تھا اور مجھے وہ اندراج قلمزد کرانا پڑا۔ اتنی تعداد

ہونے کے باوجود وہ ادارے جہاں اردو میں تعلیم دی جاتی ہے انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ یہ واقعات ثابت کرتے ہیں کہ ابھی اس ملک میں اردو کے جائز حقوق کس طرح پامال کئے جا رہے ہیں۔ شکر ہے کہ سیفیہ کالج ان چند اداروں میں ہے جہاں اردو کی بے لوث خدمت کرنے والے خاموشی کے ساتھ برسرِ کار ہیں۔ آج اردو کے لئے فضا کچھ ناسازگار معلوم ہوتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر سیفیہ کالج کے ایسے چند اور ادارے اردو کی شمع کو بادِ مخالف سے کچھ دن اور بچا لیں گے تو اردو کسی نہ کسی حد تک اپنے جائز حقوق ضرور حاصل کرے گی۔ میری دعا ہے کہ سیفیہ کالج کی طرح کچھ اور تعلیمی ادارے بھی اردو کی خدمت کرنے کی طرف اپنا قدم اٹھائیں تاکہ یہ محاذ روز بروز مضبوط ہو اور جدوجہد میں اردو دوستوں کو کامیابی نصیب ہو۔
(نامہ نگار)

نظام خطبات کے لئے پروفیسر رشید احمد صدیقی کو دعوت

دہلی: سن ۱۹۶۹ء کے نظام خطبات دینے کے لئے دہلی یونیورسٹی نے اردو کے مشہور ادیب اور نقاد پروفیسر رشید احمد صدیقی کو دعوت دی ہے۔ رشید صاحب غالب کی شخصیت اور شاعری پر دو لیکچر نظام خطبات کے تحت فروری ۱۹۶۹ء میں دیں گے۔ اس موقع پر دہلی یونیورسٹی میں غالب کا جشن صد سالہ بھی منایا جائے گا۔
(سکریٹری)

دہلی یونیورسٹی میں غالب کی سو برسی کی تقریبات کا آغاز

دہلی: مرزا اسد اللہ خاں غالب کی سو سالہ برسی کی تقریبات کا آغاز شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی کے اساتذہ و طلبہ نے مرزا غالب کی حیات اور ان کے دور پر مبنی ڈاکٹر محمد حسن کے سہ بابی ڈرامہ "کہرے کا چاند" کی تمثیل خوانی سے کیا۔ جلسہ کی صدارت ڈاکٹر بی این گنگولی وائس چانسلر دہلی یونیورسٹی نے کی۔ جلسہ کا آغاز پروفیسر خواجہ احمد فاروقی صدر شعبۂ اردو کی تقریر سے ہوا۔
(سکریٹری)

حلقۂ ادب رانچی کی خصوصی نشست

حلقۂ ادب رانچی کی ایک خصوصی نشست اردو کے ممتاز و معروف شاعر جناب حسن نعیم کے اعزاز میں مورخہ ۳ ستمبر ۱۹۶۸ء کو ڈاکٹر غفران بے صاحب پرنسپل رانچی پولی ٹکنک کی رہائش گاہ پر منعقد ہوئی۔ جناب ابوذر عثمانی صدر حلقۂ ادب نے حسن نعیم صاحب کا حاضرین سے تعارف کرایا اور ان کی ادبی اور شاعرانہ خدمات کا تفصیل سے جائزہ لیا۔ جناب حسن نعیم نے اس موقع پر اپنے مخصوص دھیمے اور پرسوز لہجے میں اپنی کئی نظمیں غزلیں سنائیں جن سے سامعین بے حد محظوظ ہوئے۔ انھوں نے خود اپنے ادبی اور شاعرانہ موقف کی بھی وضاحت کی۔ اس نشست میں مقامی شعراء نے بھی شرکت فرمائی اور اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ فرمایا۔
(منظر مسعود ایم۔ اے سکریٹری)

شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں یوم سرسید

علی گڑھ ۱۷؍ اکتوبر ۶۸ء یوم سرسید پر شعبۂ اردو کا ایک خصوصی جلسہ آج جناب خلیل الرحمٰن پرو وائس چانسلر کی صدارت میں فیکلٹی آف آرٹس لاؤنج میں ہوا۔ صدارتی تقریر میں جناب صدر نے سرسید کے علمی، اصلاحی اور قومی کارناموں کا جائزہ لیا۔ موصوف نے کہا کہ سرسید کے بعض نکتہ چیں ان کو بیسویں صدی کے حالات میں سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں اور جب وہ سرسید کو آج کے حالات کے مطابق نہیں پاتے تو ان پر بے سروپا اعتراضات کرتے ہیں۔ دراصل سرسید کو انیسویں صدی کے حالات کے پس منظر میں دیکھنا چاہئے۔ سرسید نے جس انداز سے ہندوستانیوں کی عموماً اور مسلمانوں کی خصوصاً اصلاح کا کام شروع کیا اور مخالفتوں کا مقابلہ کیا اس کی مثالیں ہندوستان کی تاریخ میں بہت کم ہیں۔ وہ جس سائنسی انداز فکر کو عام کرنا چاہتے تھے اس کی اہمیت کا صحیح اندازہ ہم کو انیسویں صدی ہی کے پس منظر میں ہو سکتا ہے۔

صدر کی تقریر کے بعد شعبۂ اردو کے ریسرچ اسکالر جناب اصغر عباس نے اپنا مقالہ "سرسید کی شخصیت کے چند پہلو خطوط کے آئینے میں" پڑھا۔ اس مقالہ میں سرسید کی مختلف تحریروں سے ان کی شخصیت کے اہم نقوش کو ابھارا گیا تھا اور خاص طور سے صحافت کے میدان میں ان کے کارناموں کا تجزیہ کیا گیا تھا۔

اصغر عباس صاحب کے مقالے کے بعد شعبۂ اردو کے ایک اور ریسرچ اسکالر جناب آفتاب شمسی نے اپنا مقالہ "سرسید کے تعلیمی تصورات تہذیب الاخلاق کی روشنی میں" پڑھا۔ اس مقالے میں آفتاب شمسی صاحب نے سرسید کی اہم تحریروں کے حوالے سے ان کے تعلیمی منصوبے اور مقصد کا تفصیلی جائزہ لیا۔

آفتاب شمسی کے مقالے کے بعد شعبۂ لسانیات کے صدر پروفیسر مسعود حسین خاں نے "سرسید اور اردو ذریعہ تعلیم" کے موضوع پر تقریر کی۔ تقریر کے ابتدائی حصہ میں موصوف نے ان تاریخی حالات کا جائزہ لیا جس میں سرسید نے اپنے قومی کاموں کا خاص طور سے تعلیمی کاموں کا آغاز کیا۔ پروفیسر مسعود حسین خاں نے کہا کہ اگر ہم سرسید کو ان کے صحیح پس منظر میں دیکھیں تو ہمیں اندازہ ہو گا کہ انھوں نے بیشتر تاریخی صداقتوں کو سمجھ لیا تھا۔ انھوں نے ایک زمانہ کی رَو کا مقابلہ جس پامردی ہمت اور استقلال سے کیا اس کی مثالیں ہندوستان کی تاریخ میں بہت کم ملتی ہیں۔ اور مجھے یہ کہنے میں تامل نہیں ہے کہ سرسید نے اپنے عہد کے مسائل کا بڑا ہی مکمل اور جامع حل تلاش کر لیا تھا لیکن سرسید کی فکر سے ابدی خیالات کا مطالبہ اور آج کے حالات میں ان کی فکر اور ان کے ارشادات پر سو فیصدی عمل خود سرسید کے ساتھ زیادتی ہو گی۔ یہ ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ سرسید کی زندگی کا آغاز ایک مستشرق (ORIENTALIST) کی حیثیت سے ہوا اور ان کا

انجام ایک "یوروپین" (EUROPEAN) پر ہوا۔ یعنی شروع میں وہ علوم کی تدریس کے لئے مشرقی زبانوں کو اور خاص طور سے اردو کو ذریعہ بنانا چاہتے تھے لیکن آہستہ آہستہ انھوں نے اپنے اس نقطۂ نظر کو بدل دیا اور وہ انگریزی کے ذریعہ تعلیم کو ضروری خیال کرنے لگے۔

عہد جہانگیر سے اردو کے ذریعہ فارسی پڑھانے کی مثالیں ملتی ہیں لیکن فارسی ہی ذریعہ تعلیم تھی۔ اردو اجس میں دکن میں اہم شعراء پیدا ہو چکے تھے، ذریعہ تعلیم کے طور پر استعمال نہیں کی گئی۔ فورٹ ولیم کالج میں البتہ ایک کوشش ملتی ہے لیکن اس کالج کا مقصد بہت محدود تھا دلی کالج میں پہلی بار اردو کو تمام علوم پڑھانے کے لئے استعمال کیا گیا۔

لارڈ میکالے کے اثر سے ہندوستان میں انگریزی ذریعہ تعلیم کے لئے عام طور سے استعمال ہونے لگی۔ شروع میں سرسید لارڈ میکالے کے خیالات کے خلاف تھے اور ایک ورناکیولر یونیورسٹی قائم کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ لیکن ۱۸۶۹ء میں انگلستان کے سفر کے بعد ان کے خیالات میں ایک انقلاب عظیم آیا اور وہ سرتاسر انگریزی کے ذریعہ تعلیم دینے کے حق میں ہو گئے یہ بات قابل ذکر ہے کہ ان کے بیٹے سید محمود، جن کی تعلیم مغربی انداز پر ہوئی تھی، سرسید کے نقطۂ نظر کی اس تبدیلی سے متفق نہ تھے۔ سید محمود کی تعلیمی اسکیم (۱۸۷۳ء) اس کا کھلا ہوا ثبوت ہے جس میں دو فیکلٹیوں کے قیام پر زور دیا گیا ہے۔ ایک اردو فیکلٹی اور دوسری انگریزی فیکلٹی۔ کالج میں دونوں فیکلٹیاں شروع کی گئیں لیکن ۱۸۸۶ء تک اردو فیکلٹی میں طلبہ کی تعداد اتنی کم ہو گئی کہ سرسید کو اس فیکلٹی کو ختم کرنا پڑا۔ فیکلٹی ختم کرنے کا اعلان کرتے ہوئے سرسید نے کہا کہ میں جانتا ہوں کہ اس فیصلے سے سید محمود کو اتفاق نہیں ہے اور وہ اردو فیکلٹی کو جاری رکھنے کے حق میں ہیں لیکن میرے خیال میں اب اس کا جاری رہنا مفید نہ ہوگا۔ یہی نہیں پنجاب یونیورسٹی میں جب اردو کو ذریعہ تعلیم بنانے کی کوشش شروع ہوئی تو سرسید نے کئی مضامین لکھ کر اس کوشش کی مخالفت کی۔ اور مشرقی طریقہ تعلیم کے نقائص کو واضح کیا۔ سرسید کے نقطۂ نظر کی یہ تبدیلی اس زمانے کے حالات کی پیداوار ہے اور اس کو اسی کی روشنی میں دیکھنا چاہئے۔ لیکن یہ بات عام طور سے تسلیم کر لی گئی ہے کہ مادری زبان ہی صحیح ذریعہ تعلیم بن سکتی ہے اور جمہوریت کا تقاضا یہ ہے کہ صرف ایک مخصوص طبقے (ELITE) پر نہ رہے بلکہ سارے عوام کی ترقی ہو۔ یہ ترقی صرف مادری زبان کے ذریعہ ممکن ہے مگر چونکہ ہندوستان عبوری دور سے گزر رہا ہے اس لئے ابھی کچھ عرصے تک انگریزی ذریعہ تعلیم رہ سکتی ہے مگر بالآخر مادری زبان کو اس کی جگہ لینی ہے۔ اس حقیقت کو ذہن میں رکھ کر ہمیں اپنا تعلیمی پروگرام بنانا چاہئے اور لمبی مدت کے لئے پروگرام اور عبوری دور کے لئے پروگرام دونوں کے متعلق واضح ذہن پیدا کرنا چاہئے۔

پروفیسر مسعود حسین خاں کی تقریر کے بعد پروفیسر ہارون خاں شروانی نے ایک مختصر تقریر کی۔ موصوف نے ان اعتراضات پر سخت تنقید کی جو عام طور سے سرسید پر کئے جاتے ہیں۔ شروانی صاحب نے کہا کہ سرسید نے زندگی کے ہر شعبہ میں اصلاح کی بنا ڈالی کو رواج دینے کی ان کی کوشش ان کی دور اندیشی کی دلیل ہے انھوں نے کہا کہ جامعہ عثمانیہ ایک طرح سے علی گڑھ کی وارث ہے۔ جو کام علی گڑھ نہ کر سکا وہ جامعہ عثمانیہ نے کیا۔

ہارون خاں شروانی کی تقریر کے بعد خواجہ مسعود علی ذوقی نے سرسید کے ایک مضمون "حکایت نادان خدا پرست اور دانا دنیادار" کو اپنے مخصوص ڈرامائی انداز میں پڑھ کر سنایا۔

پروگرام میں پروفیسر آل احمد سرور کا مقالہ "اسلام کے سلسلے میں سرسید کے نقطۂ نظر کی آج کے ہندوستان میں اہمیت" بھی شامل تھا جو وقت کی تنگی کی وجہ سے نہیں پڑھا جا سکا اور بعد میں کسی مناسب موقع پر پڑھا جائے گا۔

انجمن ترقی اردو شاخ کلکتہ کا جلسہ

کلکتہ۔ انجمن ترقی اردو ہند، ضلعی شاخ کلکتہ کی جانب سے پروفیسر کرامت علی صاحب کرامت کے اعزاز میں ایک جلسہ محمد جان ہائر سکنڈری اسکول میں منعقد کیا گیا۔ جلسہ کی صدارت جناب سالک لکھنوی نے فرمائی۔ پروفیسر کرامت علی نے 'نئی شاعری' پر تقریر کی۔ موصوف نے اپنی تقریر میں فرمایا کہ مصوری کی طرح شاعری نے بھی مختلف ادوار میں مختلف نظریوں کو اپنایا ہے۔ انھوں نے اردو شاعری پر بین الاقوامی تحریکوں مثلاً اصلیت تاثریت، پیکریت وغیرہ کے اثرات کی نشاندہی کی اور بڑی خوبی سے شاعری کا مطلب اور اس کا ارتقا تاریخی پس منظر کی روشنی میں سمجھایا۔ انھوں نے فرمایا کہ وہ نئی شاعری کے مخالف نہیں ہیں۔ اس میں بھی اچھی شاعری ہو سکتی ہے بشرطیکہ شاعر شاعری کے اصل تقاضوں کو پیش نظر رکھے۔

صدر جلسہ کی تقریر کے بعد شعراء کرام مہمان خصوصی اور صدر صاحب نے سامعین کو اپنے کلام سے جن میں 'نئی شاعری' کے اچھے نمونے بھی شامل تھے محظوظ فرمایا۔

(غلام قادر خاں جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو کلکتہ)

نمائش کلب حیدرآباد میں کل ہند مشاعرہ

حیدرآباد۔ جامعہ عثمانیہ کی گولڈن جوبلی تقاریب کے سلسلے میں انجمن طیلسانیین عثمانیہ کے زیر اہتمام ایک کل ہند مشاعرہ نمائش کلب میں منعقد ہوا۔ مشاعرہ کے فرائض جامعہ عثمانیہ کے ممتاز اور مشہور شاعر جناب سکندر علی وجد نے انجام دئے۔ اس محفل شعر میں میر ہاشم، اختر حسن، قاضی سلیم، عزیز قیسی، شہریار، وحید اختر، خلیل الرحمٰن اعظمی، خمار بارہ بنکوی، جگن ناتھ آزاد کے علاوہ علامہ حیرت بدایونی، سلیمان اریب، شاذ تمکنت، سعید شہیدی، انور معظم، حکیم یوسف خاں، صلاح الدین نیر، تاج مہجور، اوج یعقوبی، ابوالفضل محسن اور رفعت سیم نے حصہ لیا۔ (سیاست)

اہلِ پنجاب، ہریانہ اور اردو گھر — ایک اپیل

پنجابیوں کی زبان اردو نہیں تھی لیکن انتساب سے وہ اہلِ زبان بن گئے۔ حالی، آزاد، ہمارے لال آشوب ابر جوہر جن تاثر سیفی اور اس کے بعد یگانہ، جگر، اصغر، سیماب، اور تاجور کو ان لوگوں نے بلایا۔ ان کی خدمت اور اردو زبان کی خدمت کی ذریعہ تعلیم اردو ہوئی، عدالتی زبان اردو ہوئی اور لاہور، دلی، لکھنؤ اور حیدرآباد کی طرح اردو کا مرکز بنا۔

برا ہو اس تقسیم ملک کا اب یہی زبان وہاں ختم ہوتی جارہی ہے۔ پھر بھی پنجاب اور ہریانہ میں ابھی لاکھوں آدمی اردو کے شیدائی ہیں۔ ابھی تک ان کا اوڑھنا بچھونا اردو ہے۔ ان کا فرض ہے کہ وہ دلی میں اردو گھر کی تعمیر کے لئے دل کھول کر چندہ دیں۔ چنڈی گڑھ، امرتسر، لدھیانہ، جالندھر، انبالہ، پٹیالہ، رہتک، حصار، کرنال، ریواڑی اور دوسرے شہروں اور قصبوں میں ایک بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو صاحب استطاعت بھی ہیں اور صاحب ذوق بھی۔ وہاں کی صوبائی حکومتیں اگرچہ ہندی پنجابی کی حامی ہیں، اردو کی دشمن نہیں۔ ان کا اور تمام شہریوں کا فرض ہے کہ وہ اس نیک کام میں مالی امداد دیں۔ ایک صوبائی جدوجہد دونوں صوبوں میں ہو اور چندہ براہِ راست جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ کو چیک یا منی آرڈر سے بھیج دیا جائے۔

بہت سے نام میرے ذہن میں ہیں۔ یہاں ان کا ذکر کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ ضرورت محسوس ہوئی تو ان سب کو فرداً فرداً لکھوں گا۔

(عرش ملسیانی۔ ماڈل ٹاؤن دلی)

انجمن ترقی اردو دہلی نے گاندھی جینتی منائی

دہلی۔ مہاتما گاندھی کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے ۲ر اکتوبر کی شام کو غالب جناب یونس سلیم صاحب کی صدارت میں ایک نشست منعقد ہوئی۔ ہیرالال فلک اور جگن ناتھ آزاد نے گاندھی جی کو منظوم خراج عقیدت پیش کیا۔ ڈاکٹر سعید انصاری نے "گاندھی جی اور اردو" کے عنوان سے تقریر کی۔ ڈاکٹر سعید انصاری نے فرمایا کہ گاندھی جی نے اردو کو ہندی کی طرح سمجھا۔ حالانکہ عام طور پر اردو والوں کو یہ غلط فہمی ہے کہ گاندھی جی ہندی کو زیادہ پسند کرتے تھے۔ وہ صرف یہ چاہتے تھے کہ شمالی ہند کی زبان مشرق کی طرح جنوب میں بھی پہنچ جائے۔ اس مقصد کے لئے انھوں نے دکھنی بھاشا بنائی، تاکہ اردو کو پورے ملک میں سمجھا اور بولا جائے جو زبان وہ بولتے تھے اس کو تقریباً سبھی لوگ سمجھ لیتے تھے۔ آخر میں ڈاکٹر صاحب نے گاندھی جی کا خط اس سلسلہ میں پڑھ کر سنایا۔ مفتی عتیق الرحمٰن صاحب نے فرمایا کہ "ہم گاندھی جی کے عقیدوں سے دن بدن دور ہوتے جارہے ہیں۔ گاندھی جی چاہتے تھے کہ اس ملک کے سب لوگ مل جل کر رہیں اور ایک دوسرے کے جذبات کا خیال کریں۔ جناب یونس سلیم نے کہا کہ یہ انتہائی بڑا افسوسناک ہے کہ ہماری زبان کے آگے کوئی اور زبان پہنچ نہ پائے اس طریق کار نے ہندوستان بھر میں تعصب کی آندھی چلا دی ہے اب یہ ہمارا فرض ہے کہ گاندھی جی کے جلائے ہوئے اس آشتی کے چراغ کو اس خوفناک آندھی سے بچانے کی کوشش کریں۔ خدا ہم سب کو گاندھی جی کے بتائے ہوئے راستے پر چلنے کی توفیق عطا کرے۔

(جنرل سکریٹری)

مالک انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ پرنٹر و پبلشر سید بنیاد علی نے لیتھو کلر پرنٹرس علی گڑھ میں چھپایا اور دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ سے شایع کیا